www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

زید حامد

urdukutabkhanapk.blogspot

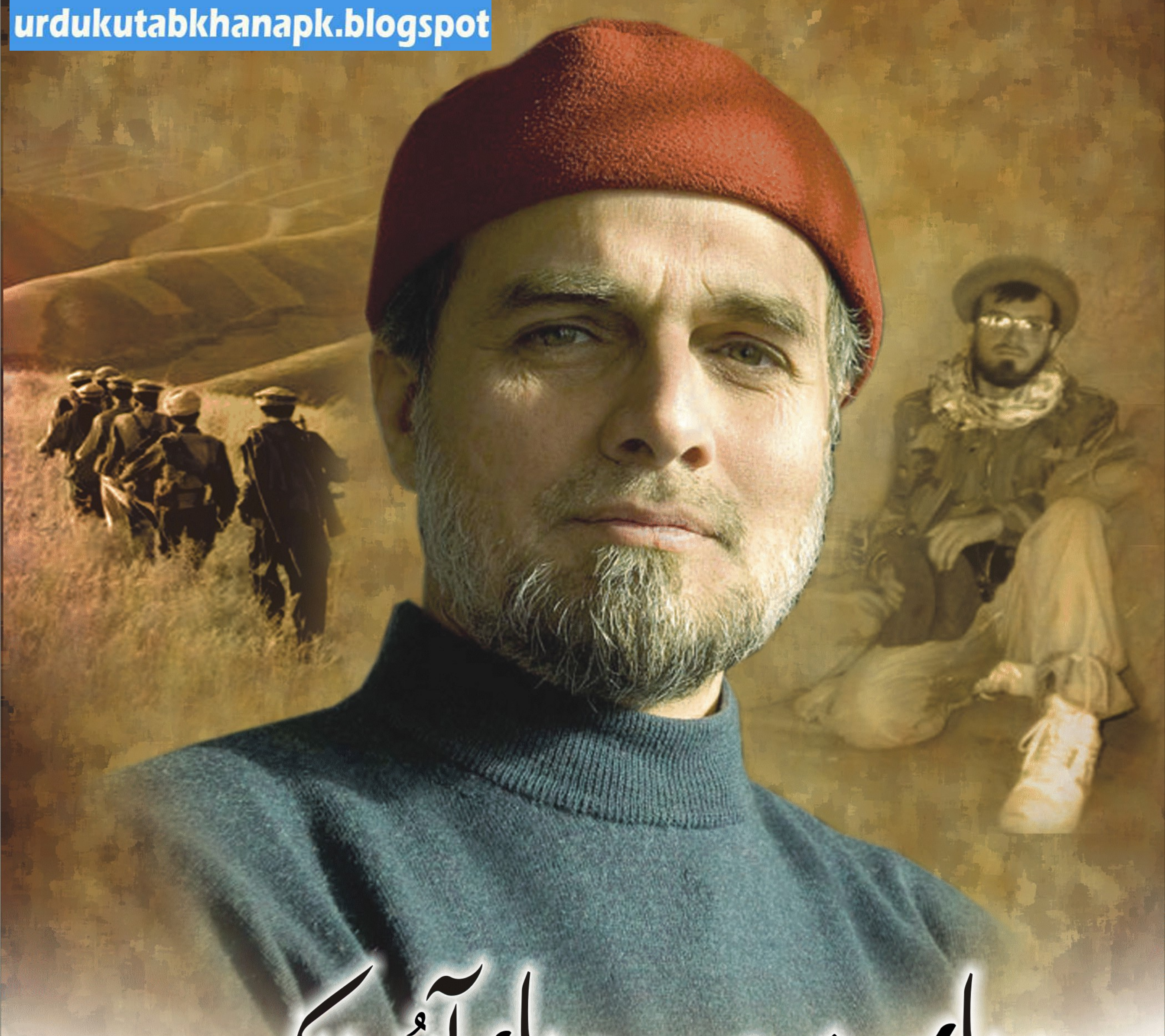

دریائے سندھ سے دریائے آمُو تک

یادداشتیں

تاریخ کی سلگتی راہوں میں مشاہدات و تجربات کا ایک رومانوی سفر

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

۱

تو یوں آغاز ہوتا ہے......

جولائی ۱۹۹۱ء، صبح کی روشن دھوپ میں خنک ہوا سرگوشیاں کررہی تھی اور میں دریائے آمو کے کنارے کھڑے ہوکر گدلے پانیوں کے پار دور تاجکستان کے بنجر سرمئی پہاڑ اور اُفق پہ جھلملاتے روسی فوج کے بنائے پہرے کے مینار دیکھ رہا تھا۔ ''وہ بھی ضرور ہمیں دیکھ رہے ہونگے''، میں نے سوچا۔

قدیم دور کے مناظر ایک ایک کرکے میری نظروں کے سامنے سے گزرنے لگے۔ ہر ایک منظر کا پُرجوش آمو کی لہروں سے اختلاط مجھے اُس دور میں لے گیا کہ جب تیرہ سو برس قبل مسلم افواج نے اس رومانوی اور سرکش دریا کے پار اپنی فتح کے جھنڈے گاڑے تھے۔ مگر پھر بھی دنیا بھر کے مسلمان مورخ آج تک آمو کو ایک ایسی آبی سرحد قرار دیتے ہیں کہ جہاں سے آگے ایک دوسری دنیا آباد ہے۔ دریائے آمو، عالم عرب اور مشرق وسطیٰ میں واقع مسلم تہذیب کے گڑھ کے لیے نہر، یعنی دریا، تھا اور تمام مسلم وسط ایشیائی ریاستیں ماوراٗالنہر، یعنی دریا کے اُس پار بسنے والی بستیاں۔ صدیوں کی روایات کا یہ بہتا آئینہ، افواج، نظریات یہاں تک کہ مکمل تہذیبوں کو اپنے پار آتا جاتا دیکھتا رہا۔ اگرچہ اسلامی افواج کی ابتدائی کامیابیوں کے بعد زیادہ تعداد اُن افواج اور نظریات کی تھی کہ جو جنوب میں افغانستان اور ہندوستان کی جانب سفر کرتے رہے۔

قسمت مجھے اس خطے پہ حملہ آور ہونے والی حالیہ سامراجیت کی شکست اور پسپائی کے منظر دکھانے یہاں لائی تھی۔ ایک تاریخ ساز واقعہ رونما ہو چکا تھا۔ روس کے تین سو سال سے چمکتے سورج کو افغان سرزمین میں گرہن لگ چکا تھا۔ واپسی مشکل تھی مگر ناگزیر۔ تمام وسط ایشیا میں نوآبادیاتی طاقت کے خلاف علم بغاوت بلند ہو رہے تھے۔ یکے بعد دیگرے وسط ایشیائی ریاستیں آزادی کا اعلان کر رہی تھیں۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اُس دن دریائے آمو کے کنارے کھڑا میں ایک شکست خوردہ فوج کو ایک ایسے مقبوضہ علاقے کی حفاظت کرتے دیکھ رہا تھا کہ جہاں سے ممکنہ طور پر ان پر جوابی حملہ کیا جا سکتا تھا۔ ماحول میں ایک تناؤ تھا جسے کم کرنا کسی کے اختیار میں نہیں تھا مگر اس جمود کو توڑا جا سکتا تھا۔ اسی خیال سے میں نے مال غنیمت میں حاصل شدہ اپنی روسی کلاشنکوف (AK-47) کو اُٹھایا اور دریا کے اُس پار پہاڑوں کا نشانہ لے کر ایک فائر داغ دیا۔ مجھے وادی میں گونجتی گولی کی آواز سے ایک سنسناہٹ اپنی رگوں میں اترتی محسوس ہوئی۔ یہ ماوراُالنہر کی آزادی میں میرا ادنیٰ سا علامتی حصہ تھا۔ تاریخ بدل رہی تھی، دنیا بدل رہی تھی اور شاید مغلوب قوموں کی سوچیں بھی۔ تمام وسط ایشیائی ریاستیں سوویت غلبے سے آزادی پانے کی جدوجہد میں مصروف تھیں۔ افغانستان میں سوویت یونین کی پیش قدمی کریملن کے لیے ایک تاریخی ناکامی بن جائے گی، یہ شاید اُس نے خواب میں بھی نہ سوچا تھا اور پھر صرف دو ماہ بعد، ۹ ستمبر ۱۹۹۱ء کو تاجکستان نے بھی اپنی آزادی کا اعلان کر دیا۔

صبح کی چمکتی دھوپ میں میرا ذہن اُن واقعات کو بھی ایک ایک کر کے میری نگاہوں کے سامنے بکھیر رہا تھا کہ جو مجھے یہاں تک کھینچ لائے تھے۔ میرے لیے یہ ایک طویل، مہم جویانہ اور خطرناک مسافت تھی۔ گزشتہ چھ برس سے میں افغان جہاد سے وابستہ تھا۔ ہلاکت خیز معرکوں میں ایک عام سپاہی سے لے کر ایک جز وقتی ڈاکٹر، صحافی، میڈیا کنسلٹنٹ، فوٹو گرافر، تکنیکی معاون، آراء ساز، مبلغ اور تحریک مزاحمت کی طرف سے حکومت پاکستان کے ساتھ مذاکرات کار تک کا کردار میرے حصے میں آیا۔ افغانستان کی جنگ میں گھری سرزمین پر میری یہ خطرناک اور جنونی مسافت کبھی مجھے جنوب میں پکتیکا تک لے گئی اور کبھی میں دریائے آمو کے کنارے کھڑا اُفق پر وسط ایشیا کو دیکھتا رہا۔ میں نے افغانستان کی جلتی زمین پر تاریخ کو بنتے دیکھا۔ لاکھوں بھوکے اور بے گھر تارکین وطن کی آہیں سنیں۔ اجڑے ہوئے گاؤں اور خاکستر زمینوں پر نگاہِ افسوس ڈالی کہ جہاں کبھی آباد بستیاں اور لہلہاتے ہوئے کھیت تھے۔ میں نے بے سروسامان بہادروں کی شاہانہ مزاحمت بھی دیکھی اور ایک سرکش سپر پاور کی آگ اور خون میں نہائی ظلم وستم کی انتہا بھی۔ بے شمار فتوحات، بے یقین شکست کے مناظر، رائیگاں خونِ خاک نشیناں اور کرب میں ڈوبی آنکھیں۔۔۔ مجھے کچھ نہیں بھولا۔ میں بہادری کی ناقابلِ یقین داستانوں اور غداری کی ناقابلِ فراموش کہانیوں کا بھی امین ہوں۔ میں اس وقت بھی افغانستان میں موجود تھا کہ جب مجاہدین کی شکست یقینی نظر آتی تھی اور میں اُس وقت بھی وہاں موجود تھا جب روسی افواج اس سرزمین کو موت کا دیس قرار دے کر ایک شرمناک انخلاء میں مصروف تھیں۔ مجھے قسمت نے ان عظیم افغان مجاہدین سے وابستگی کا موقع بھی دیا جو ایک سپر پاور کو شکست دے چکے تھے اور میں ان انصار سے بھی ملا جو کہ عالمی رضا کار تھے اور مجاہدین کی تحریک کے معاون بننے آئے تھے۔ میرا رابطہ پاک فوج میں ان طاقتور افراد کے ساتھ بھی رہا کہ جو روس کے خلاف ''ہزار خراشوں سے موت'' (Death by a thousand cuts) دینے کی حکمت عملی کے خالق تھے۔ میں اُن کی فتوحات کا گواہ ہوں، اور بدقسمتی سے اُن کی ناکامیوں کا بھی۔

یہاں میرا کام ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ ابھی مشکلات اور آزمائشوں کا ایک طویل سفر باقی تھا۔ کابل ابھی تک اشتراکی افواج کے قبضے میں

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

تھا، اور اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ تھی کہ مجاہدین کی ایک دہائی تک حمایت کے باوجود پاکستان کا افغانستان میں مستقبل تاریکی کا شکار نظر آتا تھا۔ مجاہدین کے وہ گروہ کہ جو سوویت یونین کے خلاف جہاد میں ایک برائے نام اتحاد کا حصہ بن گئے تھے، روس کی پسپائی کے ساتھ ہی مخالف قوتوں میں تبدیل ہونا شروع ہو گئے۔ انفرادی، قبائلی اور نسلی تفریق، اشتراکیت کے مٹتے ہوئے نقوش کے ساتھ اور بھی گہری ہوتی جا رہی تھی۔ کابل ابھی بھی اشتراکی قوتوں کے زیر اثر تھا اور مجاہدین کے تمام گروہ، خاص طور پر حکمت یار اور احمد شاہ مسعود کے طاقتور دھڑے، اس شہر یادگار کو فتح کرنے کے منصوبے بنا رہے تھے۔ روسیوں کے انخلاء کے بعد امریکہ کی افغان جہاد میں دلچسپی اچانک ختم ہو گئی تھی اور وہ سوویت یونین کے بکھیرے مسائل کو حل کرنے سے کترا رہا تھا۔ دوسری جانب پاکستانی حکومت بھی موقع کی نزاکت کو سمجھنے میں ناکام رہی اور ان کی حکمت عملی غفلت و سستی کا شکار تھی۔ تکبر، جہالت اور نااہلیت مل جائیں تو نتیجہ کبھی اچھا نہیں ہوتا، خاص طور پر جب کہ مقصد عظیم اور راہ دشوار ہو اور آنے والی نسلوں کا مستقبل داؤ پر لگا ہو۔

ایک طرف حکمت یار کو پاکستان کی مکمل حمایت حاصل تھی تو دوسری جانب مسعود کو یہ محسوس ہو رہا تھا کہ پاکستان نے اُسے تنہا چھوڑ دیا ہے۔ وہ یقیناً دکھی تھا۔ لیکن مسعود ایک بہترین مجاہد تھا جو حالات کے مطابق اپنی حکمت عملی تبدیل کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا اور اس نے شمال کی جانب سے کابل پہ قبضہ کرنے کا ایک آزادانہ منصوبہ ترتیب دیا۔ یہ ایک حقیقت تھی کہ اگر وہ کابل کو حکمت یار سے پہلے فتح کر لیتا ہے تو پھر پاکستان کو ہر سطح پر شکست کا سامنا کرنا پڑے گا۔ مسعود کی اس کامیابی کی صورت میں افغانستان آنے والے کئی زمانوں کے لیے نسلی خطوط پر تقسیم ہو جاتا۔ کاش! کوئی اسلام آباد میں موجود عہدیداران کو اس بات کا احساس دلا سکے کہ اگر وہ ان دونوں کرشماتی مجاہدین کی حمایت کا اعلان کر دیتے ہیں تو افغانستان پاکستان کے لیے ایک محفوظ اور قابل اعتماد اتحادی بن سکتا ہے اور کئی دہائیوں سے جاری جنگ و جدل کو ختم کر کے اس خطے کو امن کا گہوارہ بنایا جا سکتا ہے۔ اور اگر مسعود نے تنہا کابل پر قبضہ کر لیا تو۔۔۔؟؟ ایسی صورت میں وہ پاکستان سے ہمیشہ کے لیے تعلق ختم کر لے گا۔ اس سوچ کے ساتھ ہی میرے جسم کا رواں رواں مستقبل کا افغانستان دیکھنے لگا۔ وہی جنگ و جدل جو برسوں سے جاری ہے۔۔۔ نہیں! میں نے فیصلہ کیا۔ مجھے فوری طور پر پاکستان جانا ہو گا ورنہ یہ تباہی سب کا مقدر بن جائے گی۔

خیالات کی تپش چڑھتے سورج کی کرنوں میں اور بھی پر جوش ہو چلی تھی، میں نے اپنا کیمرا اُٹھایا، چند الوداعی تصاویر کھینچیں، اپنی رائفل اٹھائی اور آہستہ آہستہ اس پرانی روسی ساختہ جیپ کی طرف بڑھنے لگا کہ جو میری منتظر تھی۔ گھر جانے کا وقت آ گیا تھا۔ لیکن اس سے پہلے میں شکست خوردہ روسی فوج کو قریب سے دیکھنا چاہتا تھا۔ میں نے نجیم خان کو جیپ دریائے آمو کے کنارے چلانے کو کہا۔ دریا کے پار موجود سوویت یونین کی سرحدی چوکی رفتہ رفتہ قریب آ رہی تھی۔

....

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

رومی بدلے، شامی بدلے، بدلا ہندوستان
تو بھی اے فرزندِ کہستاں! اپنی خودی پہچان
اپنی خودی پہچان
او غافل افغان!
(اقبالؒ)

افغانستان میں، دریائے آمو کے کنارے احمد شاہ مسعود کے علاقے میں، اس یادگار اور شاید آخری سفر سے لیکر آج تک ایک زمانہ بیت چکا ہے۔ مسعود نے اسلام آباد کی مدد کے بغیر اگلے ہی برس کابل پر قبضہ کرلیا تھا اور حکمت یار اس کے بعد کبھی بھی کابل کا ابھرتا سورج نہ دیکھ سکا۔ مسعود کی حکومت کے چند مشکل برس اپنے ساتھ طالبان کا عروج لے کر آئے، کہ جنہوں نے خود مسعود کو اس کے مضبوط گڑھ پنج شیر میں محصور ہونے پر مجبور کر دیا۔ طالبان کا افغان سیاسی قوت کی حیثیت سے عروج ایک عجیب اتفاق تھا کہ جس پہ پاکستان اور افغان مجاہدین رہنما، دونوں ہی ششدر تھے۔ طالبان نے قوت حاصل کرتے ہی حکمت یار، مسعود، سیاف، ربانی، مجددی اور پیر گیلانی سمیت تمام مجاہدین رہنماؤں پہ جہاد سے غداری اور اندرونی خلفشار پھیلانے کا الزام عائد کرتے ہوئے، ان سب کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ یہ ایک ایسا وقت تھا کہ جب پاکستان کی اپنی افغان حکمت عملی سیاسی عدم استحکام کے باعث شورش کا شکار تھی۔ پاکستان نے اب تک اپنی تمام امیدیں حکمت یار سے وابستہ کر رکھی تھیں، لیکن یہ امیدیں اُس وقت دم توڑ گئیں کہ جب طالبان نے حکمت یار کو بھی شکست دے دی اور اسے سروبی میں واقع اپنا مرکز خالی کرنا پڑا۔

عمومی رائے کے برعکس طالبان پاکستان کی تخلیق ہرگز نہیں تھے۔ طالبان کو نجیب اللہ کے بعد افغانستان کی دگرگوں صورتحال نے جنم دیا۔ جب اسلام آباد مسعود کو کابل سے بے دخل کرنے کیلئے حکمت یار کی مکمل حمایت کررہا تھا تو پھر پاکستان طالبان کو تخلیق کرنے کی سیاسی غلطی کیونکر کرسکتا تھا؟ بہرکیف طالبان کا عروج پاکستان کی بے ضابطہ افغان حکمت عملی کے لیے ایک بہت بڑا دھچکا تھا کہ جسے ملا عمر نے اس وقت مزید خدشات سے دوچار کر دیا کہ جب جہادی رہنماوں کے خلاف اسکے غصے نے افغانستان میں پاکستان کے تمام اثاثے تباہ کر ڈالے۔ ہم پہ الزام تو ایسے بھی ہے، ویسے بھی سہی، کے مصداق پاکستان نے بعد میں طالبان سے اپنے روابط قائم ضرور کیے، لیکن ان کی تخلیق میں پاکستان کا کوئی کردار نہیں تھا۔ طالبان جیسی سخت خو قوت کو بنانا اور سنبھالنا کسی کے بس کا کام نہیں تھا۔

جماعت اسلامی پاکستان نے ۱۹۷۹ء کے بعد سے ہمیشہ افغان جہاد کی حمایت کی لیکن اُن سمیت کسی پاکستانی اسلامی جماعت کے طالبان کی تخلیق کے وقت اُن سے کوئی روابط نہیں تھے۔ جماعت اسلامی کے اب بھی طالبان کے ساتھ روابط کی کڑیاں نہیں ملتیں بلکہ اب تو وہ اپنے سابق دوست حکمت یار کا ساتھ بھی چھوڑ چکے ہیں۔ دیوبندی فقہ کے علما جو اپنے آپ کو پاکستان میں طالبان کا سب سے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

بڑا حامی قرار دیتے ہیں، طالبان کی تخلیق کے وقت ان کے نام سے بھی ناواقف تھے اور انہوں نے اُس وقت طالبان کی حمایت شروع کی کہ جب وہ افغانستان میں حکومت بنا چکے تھے۔

ستمبر ۲۰۰۱ء میں مسعود کو عرب خودکش حملہ آوروں کی جانب سے انتہائی پراسرار حالات میں قتل کر دیا گیا۔ کچھ ہی عرصے بعد امریکہ نے افغانستان میں طالبان حکومت کو گرا دیا اور یہ خطہ پھر سے غیر ملکی قابضین کے خلاف آزادی کی جنگ لڑنے میں مصروف ہو گیا۔ امریکہ نے افغانستان میں مسعود کی باقیات اور کرزئی جیسے کچھ درآمد کیے گئے افغان باشندوں کو ملا کر مذہبی قیادت کا متبادل لانے کی کوششیں شروع کر دیں۔ یہ وہ لمحہ تھا کہ جب افغانستان میں ایک نئی مزاحمت نے جنم لیا۔ طالبان کے ساتھ ساتھ حکمت یار اور جلال الدین حقانی بھی ایک مرتبہ پھر مزاحمتی قوت بن کر سامنے آئے۔ قدرت کی ستم ظریفی یہ کہ اب مقابلہ ایک ایسی قوت کے ساتھ ہے کہ جو سوویت جنگ میں انہی مجاہدین کی اتحادی تھی۔ ملا عمر، حقانی اور حکمت یار، اپنی بقاء کے لیے اب آپس میں اتحادی بن چکے ہیں اور یہ سب مزاحمت کار اب پاکستان سے بھی ناراض ہیں۔ افغانستان میں تباہی اور بربادی کا نیا دور اپنے ساتھ دو قوتیں لے کر آیا ہے کہ جہاں مجاہدین اور جنگجو دیہی علاقوں میں اپنا قبضہ جمائے بیٹھے ہیں اور اُن سے خونریز جنگ میں مصروف مغربی افواج کابل میں موجود کٹھ پتلی حکومت کے سر پر اپنا ہاتھ رکھے ہوئے کسی معجزے کی منتظر ہیں۔

اس تمام داستان میں اگر کسی کا سب سے زیادہ نقصان ہوا ہے تو وہ پاکستان ہے۔ کابل میں حکومت کا حصہ بنے مسعود کے حامی آج تک پاکستان کے بدترین مخالف ہیں جبکہ بھارت، امریکہ اور نیٹو افواج کے ساتھ قریبی تعلقات رکھتے ہیں۔ ان کے لیے یہ ایک خاندانی اور خونی دشمنی بن چکی ہے کیونکہ وہ ایک طرف پاکستان کو مسعود کی موت کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں تو دوسری جانب پروفیسر برہان الدین ربانی کے قتل کا ذمہ دار بھی پاکستان کو قرار دیتے ہیں۔ حقیقت اس کے برعکس ہے کیونکہ پاکستان مسعود اور استاد ربانی، دونوں ہی کے قتل کی سازش سے بے خبر تھا۔ ۳۰ لاکھ افغان پناہ گزین اب تک پاکستان میں موجود ہیں اور واپس جانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔ تاریخ میں پہلی مرتبہ پاکستان کی مغربی سرحد پر صورتحال پرتشدد اور خطرناک ہو چکی ہے کہ جس کے اثرات پاکستان کے شہری علاقوں تک آن پہنچے ہیں۔ یہ جنگ ایک لاکھ کے قریب معصوم پاکستانیوں کے جان وجسم کی قربانی مانگ چکی ہے اور دوسری جانب ایک لاکھ سے زائد پاکستانی افواج افغان سرحد کے پار سے آنے والے ہر قسم کے دشمنوں کا مقابلہ کر رہی ہیں۔ ان میں مذہبی انتہا پسندوں سے لے کر عرب عسکریت پسند اور مقامی قبائلی ہمدردوں سے لے کر سی آئی اے، راما اور را کے بھیجے ہوئے درانداز اور دہشت گرد بھی شامل ہیں۔ صورتحال پیچیدہ ہی نہیں بلکہ ہیبت ناک حد تک خطرناک ہو چکی ہے۔

۱۹۹۱ء میں میرے ذہن میں جنم لینے والے بدترین خدشات اب حقیقت کا روپ دھار چکے ہیں۔ پاکستان واپسی پر میں اسلام آباد میں اس وقت کے ذمہ داران کو مسعود کی حمایت پر آمادہ نہ کر سکا کیونکہ یہاں حکمت عملی بنانے والے میری اس بات پر یقین کرنے کو تیار نہیں

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

تھے کہ مسعود ایک دن کابل کو تن تنہا فتح کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہ ایک ایسی غلطی تھی کہ جس کا خمیازہ خطے کی موجودہ نسلیں آج بھگت رہی ہیں۔ افغانستان کا مسئلہ دو افراد کے درمیان ایک ایسی بازی تھا کہ جس میں پاکستان نے غلط کھلاڑی پر داؤ لگا دیا۔ ۱۹۹۲ء میں جب مسعود اُستاد ربانی کی صدارت میں بننے والی حکومت میں وزیر دفاع تھا، تو میں نے دوری کی اس خندق کو پاٹنے کی آخری کوشش کی۔ میرا خیال تھا کہ میں اسلام آباد اور کابل کے درمیان اعتماد اور روابط کے فقدان کو کم کر سکوں گا۔ لیکن امید کی کرن ذرا سی جھلک دکھلا کر گم ہوگئی۔ پاکستان کے افغانستان کے حوالے سے تمام خواب ٹوٹ کر بکھر چکے تھے۔ میں خود بھی ٹوٹ رہا تھا اور پھر یہ ٹوٹا ہوا دل لے کر، میں اپنے ایک محبوب سے جدا ہوا اور دوسرے سے آن ملا، اور آج تک افغانستان لوٹ کر نہیں گیا۔

....

اُس وقت کے پاکستان اور آج کے پاکستان میں بے تحاشہ تبدیلیاں آ چکی ہیں۔ ۹۰ء کی دہائی میں حکومتیں آتی اور رخصت ہوتی رہیں لیکن ماضی میں کی گئی اُن تباہ کن غلطیوں پر احساس ندامت یا احساس محرومی کسی جانب سے نہ آئی کہ جنھوں نے افغانستان اور خود پاکستان کا مستقبل داو پر لگا دیا۔ کسی بھی حکومت نے کوئی طویل المدتی افغان حکمت عملی ترتیب دی اور نہ ہی افغان جنگ کے پیچھے کارفرما ذہنوں کے تعصب اور نااہلی کے باعث پیدا شدہ سنگین تباہی کا کوئی مطالعہ یا تجزیہ کیا گیا۔ ۱۹۹۹ء میں جنرل مشرف حکومت میں آئے جنہیں طالبان ورثے میں ملے لیکن وہ بھی کوئی اعلانیہ اور مخصوص افغان حکمت عملی نہ بنا سکے۔ سب کچھ نظریہ ضرورت کے تحت ہر گزرتے دن ترتیب دیا جاتا رہا۔

حد تو یہ ہے کہ جب پاکستان نے، امریکی دباؤ کے تحت، افغانستان میں طالبان کی حمایت سے ہاتھ کھینچا تو اس وقت بھی وہ اپنے اوپر امریکہ کے انحصار اور اپنی غیر معمولی اہمیت کا کوئی فائدہ نہ اٹھا سکا۔ پاکستان کے امریکہ سے تعلقات یکطرفہ مفاد سے آگے نہ بڑھے کہ جہاں امریکہ اپنے مفادات کی خاطر پاکستان میں اخلاقی، سیاسی اور دفاعی زبوں حالی کو ترویج دیتا رہا۔ طالبان ایک مرتبہ پھر اکھٹے ہو چکے ہیں اور امریکہ، اس کے اتحادیوں اور کابل میں اُس کی کٹھ پتلی حکومت کے لیے ایک حقیقی خطرہ بن کر ابھر رہے ہیں۔

سوویت یونین جو کام افغانستان میں قریباً پانچ لاکھ افواج کے ساتھ نہیں کر سکا، امریکہ ایک لاکھ پچاس ہزار افواج کے ساتھ کرنے کے خواب دیکھ رہا ہے۔ اس خواب کے شرمندہ تعبیر ہونے کا سوال لایعنی ہو چکا ہے۔ قابض افواج کے لیے افغانستان کی صورتحال دن بدن گھمبیر ہوتی جا رہی ہے اور وہ وقت دور نہیں کہ جب سب کچھ امریکہ کے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ افغانستان میں انتشار کا لاوہ ابلتا ہے، مچلتا ہے اور اس وقت کا انتظار کرتا ہے کہ جب یہ خطے کی تاریخ اور مستقبل کو خاکستر کر کے ساتھ بہا لے جائے گا۔

علاقائی سطح پر وہی بے چینی اور بے یقینی پھیل رہی ہے کہ جس کی سرگوشیاں مشرقِ وسطیٰ میں سنائی دیتی ہیں۔ افغانستان کے بعد امریکہ اور اس

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

کے اتحادی عراق پر بھی حملہ کر چکے ہیں اور وہاں بھی ایک خونی مزاحمت سے نبرد آزما ہیں۔ عملی طور پر عراق کے حصے بخرے ہو چکے ہیں کہ جہاں دس لاکھ سے زائد مسلمان شہید ہو چکے ہیں اور چالیس لاکھ سے زائد مہاجرین اپنے گھر بار چھوڑ کر عراق کے اندر یا پھر ہمسایہ ممالک میں پناہ لینے پر مجبور ہیں۔ تب سے لے کر اب تک، کئی مسلم ممالک کو جارحیت کے ذریعے دولخت کیا گیا، کچھ پہ جنگ مسلط کی گئی اور چند کو اندرونی خلفشار اور خانہ جنگی سے دوچار کروا کرنا کام ریاستوں میں تبدیل کیا جا رہا ہے۔

پاکستان، مصر، تیونس، لیبیاء، سوڈان، سوالیہ، یمن، شام......فہرست طویل سے طویل تر ہوتی جا رہی ہے۔ ایران اور سعودی عرب مغربی اتحادیوں کے لیے اہم ترین ہدف بن چکے ہیں اور پاکستان، شاید مشکل ترین۔

ایک طرف مغربی افریقہ سے لے کر انڈونیشیا تک تمام مسلم دنیا، مغرب کی جانب سے ایک بڑی عسکری، معاشی اور نظریاتی دراندازی کا شکار ہے تو دوسری جانب یہ ممالک مایوسی، غیض و غضب، بے توقیری اور غصے تلے دبے جا رہے ہیں۔ وقت مشکل ہے اور اس مشکل میں مزید اضافہ حکمرانی کے ایک بڑے خلاء نے پیدا کر دیا ہے کہ جسے کبھی مغربی انتہا پسند تو کبھی مذہبی جنونی قوتیں بھرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔

اگرچہ روس کو مکمل طور پر نظر انداز کر دینا زیادتی ہوگی مگر موجودہ صورتحال میں روس کے بعد چین امریکہ کا سب سے بڑا حریف بن کر سامنے آ رہا ہے۔ براعظم ایشیاء، خاص طور پر مسلم دنیا، آہستہ آہستہ ایک ایسا میدانِ جنگ بنتی جا رہی ہے کہ جہاں اہم بین الاقوامی طاقتیں توانائی کے ذرائع، تجارتی راہداریوں، فوجی اڈوں اور سیاسی برتری کی جنگ لڑ رہی ہیں۔ بھارت اس تاریخی جنگ میں محتاط انداز سے شریک ہے اور آہستہ آہستہ کسی ایسے منصوبے کو بننا چاہتا ہے کہ جو علاقائی اور بین الاقوامی طاقتوں کے درمیان آخری معرکے کے بعد سامنے آئے۔ بھارت آخری دم تک پاکستان اور امریکہ کی جنگ چاہتا ہے کہ جس میں پاکستان کی شکست اس کا دیرینہ خواب ہے۔

پاکستان مضحکہ خیز طور پر سب سے کمزور سیاسی حکمرانوں سے بھرا سب سے طاقتور مسلم ملک ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ پاکستان مغرب کی جانب سے مسلم دنیا پر قبضہ کرنے کے خواب کو حقیقت کا روپ دینے میں سب سے بڑی رکاوٹ بن چکا ہے۔ ہم ہر جانب سے دشمنوں سے گھرے ہوئے ہیں۔ ایسے میں اگر کوئی اتحادی نظر آتا ہے تو وہ صرف چین ہے۔ ایران بھی بالآخر ایک بہترین اتحادی کے طور پر سامنے آ رہا ہے۔ تہذیبوں کا تصادم ناگزیر ہے، اور اس عالمی تصادم میں پاکستان اب مکمل طور پر گھیرے میں آ چکا ہے۔ اسے ایک طرف امریکہ کی ترتیب دی ہوئی پاک افغان جنگ (Af-Pak) سے خطرہ ہے تو دوسری جانب بھارت کی سرد عسکریت پسندی (Cold Start) مسائل میں اضافہ کر رہی ہے اور یہ سب کچھ ایک ایسے وقت میں سامنے آ رہا ہے کہ جب ہمارے شہری علاقوں کو پیچیدہ اور

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

غیر مرکزی کثیر الجہتی جنگ (4GW) میں نشانہ بنایا جا رہا ہے۔

....

یہ اکتوبر ۲۰۱۱ء کی ایک ڈھلتی شام ہے۔ میری عمر کے سنتالیس برس گزر چکے ہیں۔ گرتے ہوئے بال اور بڑھتا ہوا پیٹ اشارے دے رہا ہے کہ بظاہر جوانی کا لبادہ اوڑھنے کے باوجود زندگی کی شام تیزی سے ڈھل رہی ہے۔ ماضی کے خطرات سے کھیلتے، مسائل سے الجھتے، جذباتی، انقلابی وجود کی جگہ ایک سنجیدہ، پختہ، فلسفیانہ سوچ کے حامل شخص نے لے لی ہے، گو وجود کے اندر جذبے اور حدت کی وہی تلاطم خیزی برقرار ہے۔ گزرتے وقت نے اتنی تبدیلی ضرور کی ہے کہ مجھے تنہائی پسند بنا دیا۔ اب میں قدرت کے ساتھ طویل مناظروں میں کھو جاتا ہوں۔ میں مطمئن ہوں، بلا ملال مطمئن۔ اللہ نے مجھے، ماضی اور حال، دونوں میں ایک بابرکت زندگی سے نوازا ہے اور یہ امید میرے دل میں پنپتی ہے کہ ان شاء اللہ میرا مستقبل بھی ایسا ہی بابرکت ہوگا۔

لیکن سنجیدگی سے غور کرنے پر میں سوچ میں پڑ جاتا ہوں کہ کیا آنے والے کچھ برس میں میرے پاس اتنا وقت ہوگا کہ میں تبدیلیوں سے بھی اس حیرت انگیز اور پرخطر داستان کو صفحۂ قرطاس پہ منتقل کرسکوں؟ شاید نہیں...... گو میرے پاس اب تک تصاویر اور ویڈیوز کا ایک بہت بڑا خزانہ موجود ہے کہ جو اس مضطرب دور کی تاریخ کا ایک نایاب سرمایہ ہے۔ مجھے امید ہے کہ، ان شاء اللہ، میرے قلم سے نکلنے والا کوئی بھی لفظ تاریخ کے ساتھ بددیانتی نہیں کرے گا اور اللہ کی طرف سے ہدایت مجھے خود فریبی سے بھی محفوظ رکھے گی۔ میں صرف وہی کچھ لکھنا چاہتا ہوں کہ جو میں نے ۱۹۸۶ء سے لے کر ۱۹۹۲ء تک افغان مجاہدین کے ساتھ گزارے وقت میں دیکھا اور محسوس کیا۔ یہ افغان تاریخ کے وہ اہم برس تھے کہ جنہوں نے آج کا عالمی سیاسی و جغرافیائی منظر نامہ ترتیب دیا اور آج بھی میرے ذہن کے دریچوں پر ایک رومانوی دستک دیتے ہیں۔

اب جبکہ دنیا کا منظر نامہ تبدیل ہو رہا ہے اور مسلم دنیا میں آنے والی صرف سیاسی ہی نہیں بلکہ جغرافیائی تبدیلیاں بھی پاکستان کے لیے خطرہ بن چکی ہیں، تو ایسے میں افغانستان اور پاکستان میں سرزد ہونے والی تاریخی غلطیاں اور بھی تباہ کن ثابت ہو رہی ہیں۔ آج امریکہ کو افغانستان میں شکست کا سامنا ہے اور وہ فرار ہونے کے لیے ایک ایسی حکمت عملی کی تلاش میں ہے کہ جو اس خطے میں پاکستان اور افغانستان دونوں کے لیے شورش اور بربادی لے کر آئے گی۔

آج وہ وقت ہے کہ جب پاکستان کو اس تاریخی موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے مستقبل اور تقدیر کو از سر نو ترتیب دینا چاہیے۔ پاکستان نے سوویت یونین کی افغانستان میں پسپائی کے وقت اس موقع کو ضائع کر دیا تھا اور آج تک اس بھیانک غلطی کی بھاری قیمت ادا کر رہا ہے۔ اب پاکستان کو ان غلطیوں کا اعادہ نہیں کرنا چاہیے۔ اب غلطی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ایک ایسے وقت میں کہ

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

جب پورا مشرق وسطیٰ آزمائشوں میں گھرا ہے اور پاکستان پہلے ہی حالت جنگ میں ہے، وقت کی اہم ترین ضرورت صرف ایک ہے کہ جو ہمیں واقعات کے اس خطرناک اور مہلک تغیر و تبدل سے محفوظ رکھ سکتی ہے۔ اپنی ماضی کی غلطیوں سے سبق سیکھنا!...... میں گواہ ہوں اُس زمانے کا، اُن واقعات کا، اُس تاریخ کا، کہ جو ہمیں اس موڑ تک لے آئی ہے اور میں محسوس کرتا ہوں کہ ان واقعات کو صفحہ قرطاس پہ منتقل کر کے اپنے دور کے رہنماؤں، دانشوروں اور علماء کے ضمیر کو جھنجوڑنا میری ایسی ذمہ داری ہے کہ جس کا مجھ سے روز آخرت سوال کیا جائیگا۔

تکلیف دہ حقیقت جو مجھے لہورلاتی ہے وہ یہ ہے کہ ہماری قوم اور اس کے بے توقیر حکمران اپنی ماضی کی غلطیوں سے کوئی سبق سیکھنے کو تیار نہیں ہیں۔ کیا پاکستانی قوم اور حکمرانوں نے ان حقائق سے کوئی سبق سیکھا کہ جو مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا باعث بنے؟ ۱۹۷۵ء سے مسعود کی تربیت کرنے والے پاکستان نے اس کا ساتھ کیوں چھوڑ دیا؟ کیا وہ واقعی پاکستان مخالف جذبات رکھتا تھا یا پھر یہ سب کچھ مفادات کی جنگ میں اس کے خلاف منفی پراپیگنڈہ تھا؟ ۹۰ء کی دہائی میں پاکستان کی تباہ کن افغان حکمت عملی کے ذمہ دار حکومت اور نوکر شاہی کے کون کون سے کردار تھے؟ کل کے جواری آج بھی کھیل میں اپنا کردار نہیں تو اثر ضرور رکھتے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ انہیں میری یہ سرکشی پسند نہیں آئے گی۔ حقائق سے بھاگنے کا آسان ترین راستہ انکار کا ہے کیونکہ بند دروازوں اور تاریک راہداریوں میں گزرے واقعات کا کوئی ثبوت موجود نہیں ہوتا۔

....

میں نے اپنی یادداشتیں پہلے کیوں تحریر نہیں کیں؟ اس کی بہت سی وجوہات ہیں۔ ۱۹۹۲ء کے بعد سے میں ایک ذاتی کاوش میں مگن رہا تھا تاکہ، جہاد اور مجاہدین کے ساتھ برسوں کی رومانوی وابستگی کے باعث، بنجاروں کے انداز میں گزری زندگی کو پھر سے تنکا تنکا کر کے اکٹھا کر سکوں۔ میں نے اس زمانے میں کراچی سے راولپنڈی کی جانب ہجرت کی اور شدت سے یہ محسوس کیا کہ رب کریم نے مجھے جن تین محبت کرنے والے بچوں سے نوازا ہے، اب انہیں ان کے کھوئے ہوئے باپ سے ملا دیا جائے۔ کئی برس تک میرا خاندان انتظار کی سولی پہ لٹکا صبر اور خاموشی سے میری راہ تکتا رہا تھا۔ اگرچہ میں ۱۹۹۲ء کے بعد کبھی افغانستان نہیں گیا تاہم میں نے اس زمانے میں افغان مسئلے کو اجاگر کرنے کے لیے بہت کچھ لکھا، کہ جس میں سے کچھ تحریریں قومی اخبارات کی زینت بھی بنیں۔ اس سے ایک طرف تو میرے مقصد کو تقویت ملی تو دوسری طرف مجھے یہ حوصلہ بھی حاصل ہوا کہ میری تحریریں اس قابل ہو چکی ہیں کہ انہیں پڑھا اور شائع کیا جا سکے۔ اس وقت سے ہی ایک باقاعدہ سوانح کا ارادہ میرے ذہن میں پروان چڑھ رہا تھا لیکن گزشتہ چند برس میں جہاں پاکستان کے لیے خطرات ڈرامائی انداز میں بڑھتے گئے، وہیں میری اس خواہش میں بھی اضافہ ہوتا گیا کہ میں اس مسئلے کے ایک اہم پہلو کو مکمل طور پر دنیا کے سامنے لے کر آؤں۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

یہ ایک ایسے نوجوان کے تجربات، مسافتوں اور مشاہدات کی کہانی ہے کہ جسے قسمت کی ہوائیں اڑا کر طوفان کے درمیان چھوڑ گئیں اور اس نے اس عظیم دور کے واقعات کو نہ صرف رقم کیا بلکہ ان میں اپنا حصہ بھی ڈالا۔ سو یہ قصہ ہے آفاق کی ایک ایسی کارگری کا کہ جو بیک وقت پرآشوب بھی ہے اور سخن آرا بھی، جس میں بے یقینی کے رنگ بھی ہیں اور بے ثباتی کے نگار بھی، جس میں، میں بھی ہوں اور ایک ایسی تاریخ بھی کہ جس کے مؤرخ نے اسے یادوں پہ نقش کیا اور خون دل سے سینچا۔۔۔ یہ تاریخ کے جملے کے آخر میں لگا وہ نقطہ ہے کہ جسے قدرت نے کھینچ کر لکیر بنایا۔۔۔ ایک ایسی لکیر کہ جو دریائے سندھ سے دریائے آمو تک کھنچی ہوئی ہے۔

سید زید زمان حامد

راولپنڈی

اکتوبر ۲۰۱۱ء بمطابق ذوالقعدۃ ۱۴۳۲ھ۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

۲

پشاور: پہلا نشانِ منزل

''انجینئر حکمت یار کراچی آ رہے ہیں''۔ ڈاکٹر ہاشم کا یہ جملہ سنتے ہی میں چونکا، ''کیا تم ان سے ملنا چاہو گے؟'' اس کی اس خوش کن پیشکش سے انکار ممکن ہی نہیں تھا اور میرے چہرے پہ اثبات دیکھتے ہوئے ہاشم نے فراخ دلی سے ایک اور پیشکش داغ دی، ''کل چار بجے تیار رہنا۔ میں تمہیں ساتھ لے جاؤں گا''۔ ہونے والی ملاقات کی سنسنی مجھے ابھی سے اپنی رگوں میں محسوس ہو رہی تھی۔ ایک برس، پورے ایک برس انتظار کے بعد بالآخر وہ لمحہ آن پہنچا تھا کہ جس کا میں منتظر تھا۔

انجینئر گلبدین حکمت یار افغان جہاد میں حزب اسلامی دھڑے کے سربراہ تھے۔ وہ ایک پرجوش پشتون اور ان چند افغان طلباء میں سے ایک تھے کہ جو روس کے افغانستان پر حملہ کرنے سے قبل، ۱۹۷۵ء میں پاکستان آئے تھے، تاکہ کابل میں اشترا کی حکومت کا خاتمہ کیا جاسکے۔ اس وقت کے وزیراعظم پاکستان ذوالفقار علی بھٹو نے کابل میں بڑھتے ہوئے روسی اثر ورسوخ کو ہمیشہ مشکوک انداز میں دیکھا اور اس کے علاوہ کابل کی اشترا کی حکومت کی جانب سے پاکستانی قبائلی علاقوں میں پشتون علیحدگی پسندوں کی حمایت بھی بھٹو کے لیے ناگوار تھی۔ بھٹو خاصی حد تک ایک جرأت مند آدمی تھا اور اسکی یہ خوبی اسکے انجام دیئے ہوئے کئی امور میں واضح نظر آتی ہے۔ اس نے پاکستان کے جوہری پروگرام کا آغاز کیا اور لامحالہ امریکیوں کی ناگواری مول لی۔ دوسری جانب اس نے افغانستان میں اشترا کیت کے خلاف تحریک کی منصوبہ بندی اور آغاز بھی کیا، جس پہ روسی حکمران بھی اس سے نالاں تھے۔ حکمت یار ان دنوں کابل کی انجینئرنگ یونیورسٹی میں طالبعلم تھا اور ایک سیاسی طور پر متحرک اسلامی تحریک کا رکن بھی، جس کی نظریاتی اساس مولانا مودودی، سید قطب اور حسن البنّاء جیسے اسلام پسند سیاسی مفکرین کی تعلیمات پر رکھی گئی تھی۔ حکمت یار کا دوسرا معروف ساتھی وادی پنج شیر سے تعلق رکھنے والا ایک

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

تاجک نوجوان تھا، احمد شاہ مسعود۔

حکمت یار، مسعود اور اس اسلامی تحریک سے تعلق رکھنے والے چند دیگر افغان نوجوان پاکستان آئے اور چراٹ کے علاقے میں پاک فوج سے تربیت حاصل کی۔ چراٹ، پشاور کے نواح میں ایک چھوٹا سا قصبہ ہے جو کہ پاک فوج کے اعلیٰ ترین کمانڈو یونٹ، اسپیشل سروسز گروپ (SSG) کا مرکز ہے۔ یہ نوجوان بنیادی فوجی تربیت حاصل کرنے کے بعد افغانستان واپس چلے گئے اور اپنے متعلقہ علاقوں میں اشتراکیت کے خلاف ایک مسلح جدوجہد کا آغاز کیا لیکن اس وقت تک افغان باشندے ذہنی اور مالی لحاظ سے اسلام پسندوں کے کہنے پر اپنی ہی حکومت کے خلاف مزاحمت کے لیے تیار نہیں تھے لہذا ملک بھر میں چند ایک جگہ زور پکڑنے کے باوجود یہ تحریک بغاوت بری طرح ناکام ہوگئی۔ حکمت یار اور مسعود دونوں حکومتی عتاب سے بچ نکلنے میں کامیاب ہوئے اور پھر بالآخر دسمبر ۱۹۷۹ء میں مزاحمتی تحریک کے آغاز کے بعد اپنے اپنے اہم دھڑوں کے سربراہ کے طور پر سامنے آئے۔ تاہم ناکام شورش کے نتیجے میں کابل کی روس نواز حکومت نے اسلام پسندوں سے کسی بھی قسم کا رابطہ رکھنے والے افراد کے خلاف ایک بے رحمانہ آپریشن کا آغاز کر دیا تھا۔ جس کے نتیجے میں بہت سے اہم اسلامی رہنما گرفتار اور شہید کر دیئے گئے۔

....

کابل میں موجود کمیونسٹ جماعت اس وقت تک دو شدید مخالف دھڑوں ''خلق'' اور ''پرچم'' میں تقسیم ہو چکی تھی اور ان دونوں میں ایک دوسرے کے خلاف شدید منافرت پائی جاتی تھی۔ کابل کی حکومت کے خلاف بار بار بغاوت ہوتی رہی اور مختصر عرصے میں کئی صدور تبدیل کیے جاتے رہے۔ ۱۹۷۳ء سے ۱۹۷۸ء تک سردار داؤد خان جمہوریہ افغانستان کے صدر رہے تاہم انہیں ۱۹۷۸ء میں

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

مارکسسٹ نظریات سے متاثر جماعت پیپلز ڈیموکریٹک پارٹی آف افغانستان (PDPA) کی جانب سے بغاوت میں قتل کر دیا گیا۔ ان کے بعد ۱۹۷۹ء میں نور محمد ترکئی کو صدر بنایا گیا تاہم ۱۴ستمبر ۱۹۷۹ء کو وہ بھی حفیظ اللہ امین کے ہاتھوں قتل ہو گیا جو کہ خود بھی سوویت یونین کی جانب سے افغانستان پر حملے کے دوران دسمبر ۱۹۷۹ء میں اپنے ساتھیوں سمیت قتل کر دیا گیا۔ اس کے بعد ببرک کارمل کو صدر بنایا گیا جو کہ ۱۹۷۹ء سے ۱۹۸۶ء تک اقتدار میں رہا تاہم سوویت یونین اس سے بھی تنگ آ گیا اور اس کی جگہ ڈاکٹر نجیب اللہ کو صدارت کے منصب پر بٹھایا گیا جو کہ ۱۹۹۲ء تک ملک کا صدر رہا۔ بالآخر ستمبر ۱۹۹۶ء میں طالبان نے اسے بھی کابل میں پھانسی دے دی۔

۱۹۸۵ء تک حکمت یار حزب اسلامی کا سربراہ اور جہاد کے حوالے سے ایک معروف نام بن چکا تھا۔ اب وہ کراچی آ رہا تھا اور مجھے اس سے ذاتی طور پہ ملاقات کا نادر موقع مل رہا تھا۔ میں اس حوالے سے بہت پرجوش تھا۔ میری عمر اس وقت اکیس برس تھی اور میں یونیورسٹی کا طالب علم تھا اور مجھے ایک ایسے شخص کی طرف سے کسی خصوصی توجہ ملنے کی قطعاً امید نہیں تھی جو کہ روسی طاقت کے سامنے مزاحمت کی قیادت کر رہا ہو۔

....

''انجینئر صاحب! یہ زید بھائی ہیں اور یہ جہاد میں حصہ لینے کا بے حد شوق رکھتے ہیں''۔ ستمبر ۱۹۸۵ء کی ایک گرم دوپہر میں بہت سے طلبا اور صحافیوں کے درمیان گھرے ہوئے ڈاکٹر ہاشم وہاج نے میرا تعارف حکمت یار سے کروایا۔ ڈاکٹر ہاشم ایک افغان طالب علم تھا اور کراچی میں میڈیکل کی تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ میں نے حکمت یار سے نظریں ملائیں۔ دھیمی سی مسکراہٹ سمیٹے اس کی نگاہ گہری اور دل میں اتر جانے والی تھی۔ اردگرد موجود مجمعے میں پھر سے گم ہو جانے سے پیشتر وہ ٹوٹی پھوٹی انگریزی اور نرم لہجے میں مجھ سے مخاطب ہوا، ''پشاور آ جاؤ، ہم تمہیں سرحد پار بھجوا دیں گے''۔ یہ کہتے ہوئے اس نے کراچی میں اپنے ساتھیوں کو میری آمد سے متعلق انتظامات دیکھنے کا اشارہ بھی کر دیا۔ ''یہ معاملہ تو کچھ زیادہ ہی جلدی نمٹ گیا''، میں نے سوچا اور ساتھ ہی میرے ہچکچاتے ہوئے دل نے ایک مضبوط فیصلہ کر لیا کہ میں افغانستان جاؤں گا۔ حکمت یار سے میری اگلی ملاقات ۱۹۸۶ء، موسم بہار میں شمالی وزیرستان میں ہوئی اور اس مرتبہ مجھے اس کے سامنے اپنا تعارف کروانے کی ضرورت نہ تھی۔

....

میں مارچ ۱۹۸۶ء تک یونیورسٹی ٹاؤن پشاور میں واقع حزب اسلامی کے مہمان خانے پہنچا۔ جہاد میں اپنا حصہ ڈالنے کے لیے دنیا بھر سے مسلمانوں کی ایک بڑھتی ہوئی تعداد یہاں پہنچ رہی تھی۔ پشاور اور اس کے نواح میں مجاہدین کے تمام گروہوں کے بہت سے مہمان

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

خانے موجود تھے۔ میں جس مہمان خانے میں پہنچا وہاں پہلے ہی عرب، افریقہ، ترکی اور مشرق بعید سے تعلق رکھنے والے لگ بھگ ایک درجن نوجوان موجود تھے۔ ان میں سے کچھ تو افغانستان میں جنگ دیکھ چکے تھے اور اب آرام کی خاطر واپس آئے تھے اور کچھ اس غرض سے یہاں پہنچے تھے کہ انہیں پہلے تربیتی مراکز میں بھیجا جائے۔

ان میں سے زیادہ تر نوجوان اپنے اپنے ممالک میں اسلامی تنظیموں اور تحاریک سے منسلک تھے اور پاکستانی سرحدی حکام یا اپنے ملک کی جانب سے کسی بھی سخت پابندی کا سامنا کیے بغیر با آسانی یہاں پہنچ گئے تھے۔ جہاد اس دور کا ''فیشن'' تھا۔ تقریباً تمام امریکہ نواز مسلم حکومتیں جہاد میں حصہ لینے والے نوجوانوں کی مدد کر رہی تھیں۔ جبکہ دوسری طرف روس کی حلیف حکومتیں کہ جن میں شام، لیبیاء اور عراق وغیرہ شامل تھے، جہاد کے غرض سے افغانستان جانے والے نوجوانوں سے بہت سختی سے پیش آ رہی تھیں۔ ایک طرف تو سعودی عرب جہاد کی نیت سے جانے والے نوجوانوں کو فضائی سفر کے کرائے میں رعایت کی پیشکش کر رہا تھا تو دوسری جانب شام، لیبیا اور عراق میں جہاد پر جانے والے مجاہدین کو پھانسی پر لٹکایا جا رہا تھا۔ افغان جہاد میں حیرت انگیز طور پر مختلف ممالک سے تعلق رکھنے والے نوجوان شامل تھے۔ آنے والے دنوں اور مہینوں میں مہمان خانوں اور پھر میدان جنگ میں میری ملاقات یوگوسلاویہ، فلپائن، چیچنیا یہاں تک کہ یورپ اور امریکہ سے تعلق رکھنے والے نومسلم نوجوانوں سے بھی ہوئی۔ یہ بات بعید از شک تھی کہ افغان جہاد میں عالم اسلام کے ہر مسلم گروپ اور سیاسی تحریک کے لیے ایک رومانوی مقناطیسی کشش موجود تھی۔ اس رومانوی کشش کو بڑی بڑی تشہیری مہمات کے ذریعے قصداً اجاگر کیا جاتا تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اس سے متاثر کیا جا سکے۔ نظریاتی سیاسی اسلام کو اشتراکی فکر کے خلاف استعمال کرتے ہوئے، امریکہ اور مغربی ممالک کی براہ راست تائید کی وجہ سے، ان دنوں پشاور پہنچنا بہت آسان ہو گیا تھا اور دنیا کے کونے کونے سے ہزاروں کی تعداد میں نوجوان یہاں پہنچے۔ اس وقت میں اس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اب سے کچھ ہی برس بعد ان نوجوانوں اور ان کی اگلی نسلوں کو تمام دنیا میں القاعدہ کا نام دے کر نشانہ بنایا جا رہا ہو گا۔

سیاسی اسلامی تحاریک سے تعلق رکھنے والے ان نوجوانوں کو افغانستان بھیجنے سے مغرب اور ان کی اتحادی مسلم حکومتوں کے دو مقاصد پورے ہوئے۔ پہلا یہ کہ اس کے ذریعے وہ افغانستان میں سوویت طاقت کے خلاف جہاد جاری رکھنے کے لیے جذباتی نوجوان مجاہدین کی تازہ کھیپ تیار رکھتے تھے۔ کسی کو علم نہیں تھا کہ سوویت یونین کب تک افغانستان میں اپنی جنگ جاری رکھے گا اور امریکہ سمیت اکثر مغربی

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ممالک اس بات کو یقینی بنانے کی کوشش کر رہے تھے کہ افغانوں کو جنگی تھکاوٹ سے بچانے کے لیے مجاہدین کو دنیا بھر سے نوجوان خون ملتا رہے تاکہ دشمن کے خلاف ان کے جذبات سرد نہ پڑ جائیں۔ افغان مہاجر کیمپوں میں بھی پڑھائے جانے کے لیے ایک نیا نصاب اور نئی کتب تیار کی گئیں کہ جن میں جہاد اور جنگ کے موضوع پر خاص توجہ دی گئی۔ اس نصاب کو تیار کرنا جہاد کی حکمت عملی کا حصہ تھا کہ جس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ۸۰ء کی دہائی کے وسط تک افغانستان میں شہید ہونے والوں کی تعداد دس لاکھ تک پہنچ چکی تھی، جس سے جنگ کے منصوبہ سازوں کے ذہنوں میں اس کے تسلسل کو قائم رکھنے کے حوالے سے خدشات پیدا ہو رہے تھے۔ مضحکہ خیز طور پر آج جب امریکی خود کو ماضی میں اپنے ہی مرتب کیے ہوئے نصاب پہ تربیت پانے والے افغان طالب علموں یعنی طالبان کے نشانے پر پاتے ہیں تو اب ان ہی نصابی کتب کو بے ضرر، جہاد مخالف مواد سے تبدیل کیا جا رہا ہے۔ یقیناً قدرت کا انصاف کرنے کا اپنا ہی انداز ہے۔ اس عمل کے پیچھے دوسرا اہم مقصد یہ تھا کہ مشرق وسطیٰ سے تعلق رکھنے والی یہ تمام عرب مسلم حکومتیں اپنے معاشروں کو ان عناصر سے پاک رکھنا چاہتی تھیں کہ جو مستقبل میں ان کے لیے اسلامی نظام کا مطالبہ کر کے سیاسی خطرہ ثابت ہو سکتے تھے۔ یہ منصوبہ کافی حد تک کامیاب رہا کیونکہ اس دور میں افغانستان میں ہونے والی اموات میں بیس ہزار کے قریب عرب اور غیر ملکی مسلمان شامل تھے جبکہ ہزاروں کی تعداد میں مزید کسی نہ کسی موقع پر براہ راست جہاد سے وابستہ رہے۔

اس موقع پہ اگر میں تمام عالم اسلام سے خود کو رضا کارانہ طور پہ جہاد کے لیے پیش کرنے والے ان نوجوانوں کے حوالے سے مختصراً کچھ بیان کرتا چلوں تو مناسب ہوگا۔ ایسا کرنا اس لیے بھی ضروری ہے کیونکہ یہ موضوع آج تک جہالت یا پھر بدنیتی سے پھیلائے گئے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

پراپیگنڈے کے باعث غلط طور پر سوچا، سمجھا اور بیان کیا گیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ۸۰ء کی دہائی کے سوویت مخالف عرب مجاہدین کے بارے میں آج عالمی رائے عامہ تبدیل ہو چکی ہے۔ یہ نوجوان کون تھے؟ ان کے مقاصد کیا تھے؟ کیا یہ واقعی دہشت گرد تھے؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ آج ان میں سے باقی بچ جانے والے چند افراد نہ صرف شدت پسند بن چکے ہیں بلکہ اپنے غصے اور مایوسی کا اظہار بھی غیر ضروری طور پر پرُ تشدد کارروائیوں کے ذریعے کرتے ہیں، لیکن ان کو اس حد تک پہنچانے کے پیچھے چند اہم وجوہات ہیں۔ ان کے گناہوں اور جرائم میں وہ بڑے کھلاڑی بھی برابر کے حصہ دار ہیں کہ جنہوں نے پہلے انہیں جنم دیا اور پھر انہیں حالات کے رحم وکرم پہ تنہا چھوڑ دیا۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا کہ ۸۰ء کی دہائی کے اوائل میں دنیا بھر کی مسلم تحاریک کے لیے افغان جہاد عملی طور پر وہ مرکزی نقطہ تھا کہ جس کے تحت وہ ایک عالمی طاقت کے خلاف اپنے غصے کا اظہار کر سکتے تھے۔ وہ رومانوی خواب دیکھنے والے لوگ تھے۔ وہ برے لوگ نہیں تھے بلکہ سیدھے سادھے، اسلام پسند اور کبھی کبھار تو معصومانہ حد تک کم فہم۔ ان میں سے زیادہ تر کا تعلق غریب اور کم تعلیم یافتہ خاندانوں سے تھا جو جذباتی تو ضرور تھے مگر دنیاوی علوم اور جدید تعلیم سے نابلد۔ اگر چہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ڈاکٹروں، انجینئروں اور فوجی افسران نے بھی بعد میں ان میں شمولیت اختیار کر لی، تاہم ان میں سے اکثریت اسلامی دنیا کے پسماندہ تعلیمی معیار کی نمائندگی کرتی تھی۔ اسلامی تحاریک اور عرب دنیا میں افغان جہاد کے لیے ان کے ذہنوں میں موجود اسلامی خلافت کے رومانوی تصور نے ایک اور اخلاقی جواز پیدا کر دیا تھا۔ انہوں نے ایسی مذہبی شخصیات اور کرداروں کو جنم دیا کہ جن کے پیروکاران کی اندھی تقلید کرتے تھے۔ استاد سیاف ان کے نزدیک آنے والے دور کے خلیفہ تھے اور فلسطینی ڈاکٹر عبداللہ عظام تمام عرب اور غیر افغان مجاہدین کے امیر۔ پہلی مرتبہ غیر افغان مجاہدین جنگ میں اہم کرداروں کے طور پر سامنے آرہے تھے۔ عرب اور غیر افغان مسلم ذرائع سے مجاہدین کے لیے آنے والے پیسے، وسائل اور اثاثوں کا حجم امریکہ، چین اور اقوام متحدہ کی فراہم کردہ مجموعی امداد کے لگ بھگ ہی تھا۔

افغان جنگ نے مجاہدین کی ایک ایسی نئی نسل تیار کی کہ جسے افغانستان انکے خوابوں کی تعبیر نظر آرہا تھا۔ ایک ایسا ملک کہ جہاں بنیادی اسلامی اصولوں پر مبنی ریاست قائم کی جائے۔ یہ عرب مجاہد انتہائی بہادر اور حوصلہ مند تھے اور جنت کے حصول کے لیے ممکنہ طور پر ہر مختصر ترین راستہ اختیار کرنے کی خواہش رکھتے تھے۔ مگر وہ ساتھ ہی انتہائی کوتاہ اندیش بھی تھے اور اکثر غصے اور نفرت سے بھرے رہتے اور

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اپنی ہی مغرب نواز یا روس نواز حکومتوں کے خلاف ایک انتہائی غیر متوازن جنونی سوچ رکھتے تھے۔اس پرتشدد رویے کے باعث ان کی بالغ نظری سے سوچنے کی تمام صلاحیتیں بری طرح متاثر ہوئیں۔ان میں سے کچھ تو تکفیری تھے، جسے سب سے زیادہ انتہا پسند مکتبہ فکر قرار دیا جاتا ہے۔ان کی نظر میں وہ مسلمان بھی، جو ان کے خیالات سے اتفاق نہیں کرتے، کافر تصور کیے جاتے تھے۔

....

اسلامی ریاست کی تعمیر کا یہ رومانوی خواب اس وقت ٹوٹ کر بکھر گیا کہ جب سوویت یونین کی افغانستان سے روانگی اور کابل کی فتح کے بعد افغان مجاہدین میں خانہ جنگی شروع ہوگئی۔استاد سیاف کہیں گمنامی میں کھو گئے اور جہاد کے تمام ''ہیرو'' جنگ سے متاثرہ افغانستان کی باقیات پر قبضے کے لیے آپس میں ہی برے طرح لڑنے لگے۔افغانستان ایک بکھرا ہوا خواب بن کے رہ گیا تھا۔اس سے پیشتر ۱۹۸۸ء میں جنرل ضیاء کو بھی ایک فضائی حادثے میں شہید کر دیا گیا تھا اور پھر کچھ ہی ماہ بعد پشاور میں ہونے والے ایک اور کار بم دھماکے میں ڈاکٹر عبداللہ عظام کو بھی شہید کر دیا گیا، جس کے باعث پاکستان اور افغانستان میں موجود عرب مجاہدین کا شیرازہ بھی بکھر گیا۔سینکڑوں کی تعداد میں عرب اپنے اپنے ممالک کو واپس جانے لگے۔کچھ رضا کارانہ طور پر واپس جا رہے تھے اور کچھ کو پاکستان نے ملک بدر کر دیا۔ان میں سے جن عرب باشندوں کا تعلق روس نواز آمرانہ حکومتوں والے ممالک سے تھا، ان کے پاس واپسی کا کوئی راستہ نہ تھا، لہذا انہوں نے پاکستان کے قبائلی علاقوں میں ہی سکونت اختیار کر لی۔

زیادہ تر عرب مجاہدین کو وطن واپسی پر ان کی حکومتوں کی جانب سے گرفتار کر لیا گیا، خاص طور پر اشترا کی دھڑے سے تعلق رکھنے والی مسلمان حکومتوں نے تو ان مجاہدین کو درجنوں کی تعداد میں سولی پر چڑھا دیا۔وہ تمام حکومتیں جنہوں نے اپنے معاشرے کو پاک کرنے کیلئے ان نوجوانوں کو بھیجا تھا، وہ انہیں دوبارہ قبول کرنے پر تیار نہیں تھیں۔اس مایوس کن صورتحال سے نکلنے کیلئے ان مجاہدین کے پاس کوئی راستہ نہیں تھا۔ان حکومتوں نے جس ظالمانہ انداز میں ان واپس آنے والے مجاہدین کا خاتمہ کیا، اس حوالے سے آج تک کوئی تحقیق سامنے نہیں آئی۔مثال کے طور پر الجیریا میں ان ''افغان'' عرب مجاہدین نے کبھی تشدد کا راستہ اختیار نہیں کیا اور FIS کے تحت جمہوری انتخابات میں حصہ لیا لیکن جب انتخابات کے نتائج کو تبدیل کر دیا گیا اور ان کے خلاف فوجی آپریشن کیا گیا تو انہوں نے اپنی حفاظت کے لیے افغانستان میں حاصل کی گئی جنگی تربیت کا سہارا لیا۔اس طرح کے ریاستی ظلم کے خلاف ان کی طرف سے پرتشدد ردعمل کا اظہار ایک قدرتی امر تھا۔اس بات کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ ان جنگجوؤں میں کوئی شدت پسند شامل نہیں تھا تاہم یہ بات بھی درست نہیں کہ افغان جنگ سے واپس آنے والے تمام عرب یا غیر عرب مجاہد دہشت گرد تھے یا ہیں اور انہیں القاعدہ کا نام دے کر نشانہ بنانا چاہیے۔یہ یقیناً افغان جہاد اور اس کے بعد کے دور میں انکی حالت زار کی تاریخی طور پر ایک غلط منظر کشی ہوگی۔دنیا بھر میں آج بھی افغان جہاد سے واپس آنے والے ایسے کئی مجاہدین موجود ہیں کہ جو اپنے وطنوں کو واپس آنے میں کامیاب ہو گئے اور آج اپنے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

خاندانوں کے ساتھ ایک عام زندگی گزار رہے ہیں جبکہ افغان جہاد ان کی زندگی میں محض ایک پرجوش اور مہم جویانہ ماضی بن چکا ہے۔

ان غیر افغان، بے گھر، مایوس اور مفرور مجاہدین کی ایک بڑی تعداد سوڈان پہنچی، جہاں جنرل بشیر کی حکمرانی میں ان کے لیے ایک ہمدرد حکومت موجود تھی۔ جنرل بشیر، سابق اخوان رہنما اور ڈاکٹر عبداللہ عظام کے دوست، ڈاکٹر حسن ترابی سے مذہبی رہنمائی لیتے تھے۔ سوڈان نے ان تمام مجاہدین کو، جو افغانستان چھوڑنا چاہتے تھے، اپنے پاس آنے کی دعوت دی۔ اب ان عرب مجاہدین کے لیے افغانستان کا باب عملی طور پر بند ہو چکا تھا۔

۱۹۸۵ء، اسامہ بن لادن، استاد برہان الدین ربانی کے ہمراہ

سوڈان پہنچنے والے ان مجاہدین میں سے ایک عرب مجاہد اسامہ بن لادن بھی تھا، جو ایک اچھے اور مالدار سعودی خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ سعودی عرب میں تعمیرات کے اپنے خاندانی کاروبار کے تجربے کو یہاں منتقل کر کے افغان جنگ کے دوران افغانستان میں سرنگوں اور گہرے غاروں کی کھدائی سے اپنی الگ پہچان بنا چکا تھا۔ لیکن اس ایک چیز کے علاوہ اس کی شخصیت میں کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ اپنے غریب مجاہد ساتھیوں کی مدد کے لیے اس کی فراخ دلی اسے عرب مجاہدین میں مقبول بنا رہی تھی، جو افغان جہاد کے دوران اپنے مرکزی رہنماؤں کی وفات کے بعد کسی متبادل مذہبی قیادت کی تلاش میں تھے۔ سادہ لوح نوجوان عرب مجاہدین کو ہمیشہ سے کسی مذہبی قیادت کی ضرورت رہتی تھی اور وہ ہر حال میں اب کسی نہ کسی شخص کو یہ مقام دینا چاہتے تھے۔

یہ عرب مجاہدین امریکی دباؤ کے باعث سوڈان سے بھی نکال دیئے گئے اور طالبان کی حکومت قائم ہوتے ہی افغانستان واپس آ گئے۔ ڈاکٹر ترابی اور جنرل بشیر کے تعلقات بھی دن بدن خراب ہوتے جا رہے تھے اور بالآخر ڈاکٹر ترابی کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ اس طرح عرب مجاہدین کے لیے سوڈان میں موجود تمام تر ہمدردیاں دم توڑ گئیں۔ افغانستان ایک مرتبہ پھر ان کا مرکز بننے والا تھا مگر اس مرتبہ ان کے جذبات انتقامی ہو چکے تھے۔ طالبان حکومت ان ہزاروں بے گھر عرب باشندوں کے لیے امید کی آخری کرن تھی۔ اسامہ اپنے نام، نسب اور دولت کے باعث ان کے ''شیخ'' کی حیثیت سے سامنے آیا اور اس کی اس حیثیت پہ اعتراض کرنے والا بھی کوئی نہ تھا۔ وہ زندہ رہ جانے والے عرب مجاہدین میں سب سے زیادہ تجربہ کار تھا۔ وہ ایک عام سا متوسط ذہانت، نرم گفتار اور اعلیٰ اخلاق رکھنے والا ایک

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

روایتی عرب تھا جس میں نظریاتی فکر کی بہرحال کمی تھی۔ اسامہ کوئی مفکر نہیں تھا۔ وہ کوئی فلسفی، دانشور یا کوئی فوجی حکمت عملی بنانے والا صاحب نظر بھی نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آج جب میں دنیا بھر میں دہشت گردی کے ہولناک واقعات کو اس سے منسوب ہوتے سنتا ہوں تو مجھے اس بات پر بہت حیرت ہوتی ہے کہ یہ تمام کارروائیاں اس اسامہ کی نہیں ہوسکتیں کہ جس سے اس دور کے لوگ واقف تھے۔

افغان جہاد سے اپنی وابستگی کے سات برس کے دوران میں نے کبھی پشاور یا افغانستان میں القاعدہ کی اصطلاح نہیں سنی۔ ''مکتبہ الخدمات'' کے نام سے ایک ادارہ اس زمانے میں ضرور وجود رکھتا تھا، مگر اس کی حیثیت عرب مجاہدین کے لیے محض ایک انتظامی مرکز کی سی تھی۔ اس عجیب وغریب اصطلاح یعنی القاعدہ کی ابتدا کے بارے میں جاننا یقیناً ایک دلچسپ تحقیقی اور تاریخی مشق ہوگی کہ جسے آج عالمی دہشت گردی کے لیے ایک عمومی اصطلاح کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے اور اس کا تعلق اسامہ جیسے کرداروں کے ساتھ جوڑا جاتا ہے۔ افغان جنگ کے دوران القاعدہ کا کوئی نام ونشان نہ تھا۔

اگر ان میں سے کچھ لوگ آج تشدد کا راستہ اپنا رہے ہیں تو اس کے پیچھے یقیناً کوئی ٹھوس وجوہات ہیں۔ دنیا کے نظام نے انہیں جنگ میں استعمال کرنے کے بعد کبھی واپس قبول نہیں کیا اور نہ ہی انہیں دوبارہ آباد کرنے کی کوشش کی گئی۔ سعودی حکومت نے اسامہ سے اس کی شہریت بھی چھین لی اور اسے اسکے ہزاروں عرب حامیوں کی طرح بے گھر کر دیا۔ ایسے بے گھر، مایوس جنگجوؤں سے اور کیا توقع کی جا سکتی تھی؟

جب میں ۱۹۸۶ء میں یونیورسٹی ٹاؤن پشاور میں واقع حزب اسلامی کے مہمان خانے پہنچا تو یقیناً ان تمام حقائق سے لاعلم تھا اور میں اس بات سے بھی ناواقف تھا کہ اب میری زندگی کے سب سے زیادہ حیرت انگیز، سحر انگیز اور تلاطم خیز دور کا آغاز ہونے والا ہے۔

kutabkhanapk.blogspot.com